



اعترافات

مفتی منیب الرحمن

اقرار جرم کو قانون کی زبان میں Confession کہتے ہیں۔ ہم کراچی کے حالات کے حوالے سے ملز مین کے اعترافی بیانات کی افسانوی داستانیں گزشتہ دو تین عشروں سے تسلسل کے ساتھ سن اور پڑھ رہے ہیں، لیکن اس کے بعد ان کے بطن سے کچھ برآمد نہیں ہوتا اور اب یہ اعترافی بیانات مذاق بن کر رہ گئے ہیں۔ بس چند دنوں کے لیے اخبارات کو سرخیاں اور ٹیلی ویژن چینلز کو ہیڈ لائنز مل جاتی ہیں اور سیاسی مکالمے کے اینکر پر سنز کی مجالس میں کچھ دنوں کے لیے رونقیں لگ جاتی ہیں اور پھر سارا معاملہ قصہ پارینہ ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں نے بتایا کہ تفتیشی ادارے ملز مین سے جو بھی اعترافات کرانا چاہیں، وہ بخوشی اُسے قبول (Own) کر لیتے ہیں، خواہ وہ آڈیو/ویڈیو کی صورت میں ہو یا تحریری صورت میں۔ وہ چاہتے ہیں کہ تشدد سے بچ جائیں اور انہیں بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ تحقیق و تفتیش (Investigation) کے مرحلے پر اس اعترافی بیان کی کوئی قانونی حیثیت نہیں ہوتی تاوقتیکہ جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے کھلی عدالت میں اس طرح کا اعترافی بیان نہ دیا جائے۔

ایسا ہرگز نہیں ہے کہ امریکا یا مغربی ممالک میں جرم کا ارتکاب کرنے والے ہر شخص کو تلاش کر کے کیفر کردار تک پہنچایا جاتا ہے، سابقہ امریکی صدر جون ایف کینیڈی، برطانیہ کے ولی عہد پرنس چارلس کی سابقہ اہلیہ پرنسس لیڈی ڈایانا اور ماضی قریب میں ڈاکٹر عمران فاروق کے قتل کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ امریکا اور مغرب میں بھی اسٹبلشمنٹ اپنے ریاستی اور ملکی مفاد میں بعض مقدمات کی تحقیقات اور ان سے متعلق تمام حقائق کو افشا کرنے پر اثر انداز ہوتی ہے، واللہ اعلم۔ قائد ملت خان لیاقت علی خان اور سابق صدر اور چیف آف آرمی اسٹاف جنرل محمد ضیاء الحق کے سانحات قتل کی مثالیں ہمارے ہاں بھی موجود ہیں، ان کے بارے میں بالترتیب مقامی اسٹبلشمنٹ اور عالمی اسٹبلشمنٹ کے ملوث ہونے کی باتیں اکثر اشارات و کنایات میں ہوتی رہی ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ 1977 میں جناب ذوالفقار علی بھٹو اور 1999 میں جناب محمد نواز شریف کی اقتدار سے معزولی میں امریکی آشیر باد شامل تھی، کیونکہ ذوالفقار علی بھٹو مرحوم پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بانی تھے اور جناب محمد نواز شریف 1998 میں ایٹمی دھماکوں کے ذمے دار تھے، واللہ اعلم بالصواب۔

لیکن یہ ضرور ہے کہ جو مجرم امریکا اور مغربی قانون نافذ کرنے والے اداروں کی گرفت میں آجائے، وہ سزا سے بچ نہیں سکتا، کیونکہ وہ مجرم کو عدالت میں پیش کرنے سے پہلے کافی محنت و مشقت کے ساتھ جرائم کی تفتیش کے بارے میں جدید تحقیقات سے استفادہ اور فنی آلات استعمال کر کے ایسے ناقابل تردید ثبوت و شواہد اکٹھے کرتے ہیں کہ مجرم کا سزا سے بچ نکلنا دشوار ہو جاتا ہے۔ لہذا وہاں قانون اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کا بھرم اور رعب قائم ہے، جب کہ ہمارے ہاں صورت حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار سیاست زدہ (Politicised) ہو چکے ہیں، یعنی وہ وقت کے حکمرانوں یا ہر دور کے بااثر سیاست دانوں کے زیر اثر ہیں۔ قانون کے سامنے جواب دہ سمجھنے کی بجائے وہ اپنے آپ کو اپنے ان

سیاسی آقاؤں کے سامنے جواب دہ سمجھتے ہیں، جن کے پاس اُن کی تقرری، ترقی، تنزلی، تبادلے اور معزولی کے اختیارات ہوتے ہیں۔ اگرچہ وقتاً فوقتاً اعلیٰ عدالتوں کے ذی وقار جج صاحبان اُن کو ڈانٹتے رہتے ہیں، لیکن عالی مرتبت جج صاحبان بھی اسی معاشرے کے افراد ہیں اور حقیقت حال اُن کو بھی معلوم ہے کہ ملک میں قانون بھی ہے، عدالتیں بھی ہیں، لیکن اس کے باوجود قانون بے اثر وبے بس ہے اور عدل عنقا۔

لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس عزت مآب سید منصور علی شاہ نے حال ہی میں صوبہ پنجاب میں ماتحت عدلیہ کو کرپشن اور نااہلی سے پاک کرنے کا عمل شروع کیا ہے اور بڑے پیمانے پر پچلی عدالتوں کے ججوں کے تبادلے اور معزولی کے احکامات جاری کرنا شروع کر دیے ہیں۔ یہ عزم لائق تحسین ہے اور اس کی ہر ممکن تائید اور حوصلہ افزائی ہونی چاہیے، لیکن لازم ہے کہ اس مہم میں بھی پسند و ناپسند کا رفرمانہ ہو بلکہ روح عدل کا رفرما ہو۔ یہ بھی ضروری ہے کہ برسوں سے زیر التوا مقدمات کو فائلیں جھاڑ کر دوبارہ کھولا جائے اور ہر عدالتی مرحلے پر ان کے فیصل ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ مدت کا تعین کیا جائے، جس کی پابندی نہ کرنے والا جج نااہل قرار پائے۔ یہ بات بھی اظہر من الشمس ہے کہ مقدمات کے التوا میں وکلاء کا بھی بڑا دخل ہے، پس بار پر بھی لازم ہے کہ وہ انصاف کو سستا اور سریع الحصول (Speedy) بنانے کے لیے ضابطہ اخلاق بنائے اور بعض وکلاء صاحبان کی طرف سے ججوں کو ہراساں کرنے اور بلیک میلنگ کے جو واقعات و مقافو قرار پورٹ ہوتے ہیں، ان کا سد باب کرے۔

اسی طرح جرائم کی تحقیق و تفتیش کے بارے میں ایک جامع قانون سازی کی ضرورت ہے، جس میں آئینی و قانونی ماہرین اور اعلیٰ عدلیہ کے عالی مرتبت فاضل جج صاحبان اور ماہرین آئین و قانون کو بھی شامل کیا جائے تاکہ سب کی اجتماعی دانش سے تحقیق و تفتیش کے جدید طریقے اور معیارات مقرر ہوں، تحقیق و تفتیش جرائم کی جدید تکنیک اور اُس کے لیے جدید آلات اور مالی وسائل دستیاب ہوں، قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار صرف اور صرف قانون کے سامنے جواب دہ ہوں اور عدالتوں سے تصریح (Clearance) لیے بغیر تحقیقی مراحل کے دوران اُن کا تبادلہ ممکن نہ ہو۔ ہمارے ہاں ایک اور خرابی یہ ہے کہ ہمارے قانون ساز کوئی بھی قانون بناتے وقت اپنے آپ کو سامنے رکھتے ہیں، کیونکہ انہیں یہ اندیشہ لاحق رہتا ہے کہ یہ قانون سب سے پہلے انہی کی گردن ہی میں فٹ ہوگا، لہذا وہ کوئی بھی کڑا اور سخت گیر قانون بنانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسی طرح ہمارے عدالتی ضوابط کا ر (Procedural Laws) نہایت پیچیدہ ہیں اور ہمارے ماہر وکلاء قوانین کی انہی خامیوں (Flaws) سے فائدہ اٹھاتے ہیں، بال کی کھال اتارتے ہیں، قانونی موٹا کافو سے کام لے کر دلائل کا انبار لگا دیتے ہیں، الفاظ کی جادوگری کرتے ہیں اور بھاری فینسی وصول کر کے اپنے مؤکل کو قانون کی گرفت سے بچا لیتے ہیں۔ اس طرح جرائم پیشہ لوگ رہائی پا کر معاشرے میں دندناتے پھرتے ہیں اور قانون کے رکھوالے اُن سے منہ چھپاتے پھرتے ہیں۔

سواصل مسئلے کے حل کی طرف کوئی نہیں آتا۔ اکیسویں آئینی ترمیم بھی ہمارے قابل احترام قانون سازوں نے آرمی پبلک ہائی اسکول پشاور کے سانحے کے بعد چیف آف آرمی اسٹاف اور دفاعی اداروں کے دباؤ کے تحت آنسوؤں سے چھلکتی آنکھوں کے ساتھ منظور کی۔ چیئر مین سینیٹ جناب رضا ربانی اور جناب اعجاز احسن کے ریمارکس پارلیمنٹ کے ریکارڈ پر موجود ہیں۔ اس آئینی ترمیم کی مدت بھی پانچ جنوری ۲۰۱۷ کو ختم ہو جائے گی۔ سو یہ عارضی اختیارات، جو قانون نافذ کرنے والوں کو اس آئینی ترمیم کے



ذریعے حاصل ہوئے تھے، وہ ختم ہو جائیں گے اور ہم سابق دور کی طرف واپس پلٹ جائیں گے۔ سوائے اس کے کہ ایک اور آئینی ترمیم کے ذریعے اس کی مدت میں توسیع کر دی جائے۔

الغرض ہمارے وطن عزیز کے اندر بے امنی کے سدّ باب اور قانون کی حکمرانی کے مسئلے کا کوئی دیرپا حل موجود نہیں ہے۔ عدالتیں آزاد ہوں تو وہ تمام زمینی حقائق سے آنکھیں بند کر کے آئیڈیل ازم کی طرف چلی جاتی ہیں اور بعض کے بقول جسٹس افتخار محمد چوہدری جیسا جوڈیشل مارشل لانا فذ ہو جاتا ہے، وہ جس کو چاہتے بلا کر بے توقیر کر دیتے، جس کو چاہتے منصب سے معزول کر دیتے یا اُس کے اختیارات پر قدغن لگا دیتے، کسی کو مجالِ دمِ زدنئی نہیں ہوتی تھی۔ سابق وزیرِ اعظم جناب سید یوسف رضا گیلانی کو سپریم کورٹ آف پاکستان نے 26 اپریل 2012ء کو فیصلہ سنائے جانے کے دورانیے کے برابر یعنی 30 سیکنڈ کی سزا سنائی اور 19 جون 2012 کو عدالتِ عظمیٰ نے قرار دیا کہ وہ سزا یافتہ ہونے کی بنا پر وزارتِ عظمیٰ کے منصب پر فائز رہنے کے اہل نہیں رہے، پس انہیں منصب چھوڑنا پڑا۔ لیکن اس کے باوجود سوئیٹزر لینڈ میں سابق صدر جناب آصف علی زرداری کے مقدمے کو اپیل کی مدت گزر جانے کے سبب Reopen نہ کیا جاسکا اور سوئیٹزر لینڈ کے بینکوں سے تقریباً چھ کروڑ الٹرنیٹل ڈالرز نکال لیے گئے۔ الغرض ”کھودا پہاڑ، نکلا چوہا“ والا معاملہ ہوا، صرف بیچارے جناب سید یوسف رضا گیلانی نشانِ عبرت بنے۔ سابق وزیرِ مذہبی امور علامہ سید حامد سعید کاظمی کا مقدمہ بھی ایک سوالیہ نشان ہے، اس کا ایک رُخ تو یہ ہے کہ اُن کے بقول اُن پر براہِ راست کرپشن میں ملوث ہونے کا کوئی الزام نہیں لگا، انہیں سزا بھی سنا دی گئی ہے اور اسلام آباد ہائی کورٹ نے اُن کی ضمانت کی درخواست بھی رد کر دی ہے۔ فیصلے کے ایک حصے کا میں نے مطالعہ کیا ہے، لیکن اس کا صحیح جائزہ کوئی ماہر قانون ہی لے سکتا ہے۔ اسلام آباد ہائی کورٹ کے فاضل جج صاحب کے عوامی نوعیت اور واعظانہ قسم کے ریمارکس تو اخبارات میں رپورٹ ہوئے، لیکن کوئی ایک بھی ٹیکنیکل اور خصوصی نوعیت کا ریمارک، جس میں ملزم پر کرپشن کی ذاتی ذمہ داری عائد ہو رہی ہو، پڑھنے کو نہیں ملا۔ مجھے سینیئر ایڈووکیٹ جناب خالد حبیب الہی نے بتایا کہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق فرنٹ مین احمد بخش نے یہ تو کہا کہ مجھے ہی صدر آصف علی زرداری، وزیرِ اعظم سید یوسف رضا گیلانی اور ڈائریکٹر جنرل راولپنڈی سمجھیں، لیکن اس نے صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی کا نام نہیں لیا، واللہ اعلم بالصواب۔ ایسے بھی کوئی شواہد پیش نہیں کیے گئے کہ فرنٹ مین نے کوئی رقم صاحبزادہ سید حامد سعید کاظمی کو بلا واسطہ یا بالواسطہ دی ہو۔

اسی طرح ہمارے قانون میں یہ سقم بھی ہے کہ کوئی ملزم کسی بھی صورت میں اگر ملک سے باہر جا چکا ہو اور عدالت کے سامنے پیش نہ ہو رہا ہو، تو عدالت اُسے مفرور اور اشتہاری تو قرار دے دیتی ہے، لیکن اس کا مقدمہ موقوف ہو جاتا ہے اور وہ تمام عدالتی و قانونی مراحل طے کر کے حتمی اور قطعی فیصلے کے مرحلے تک نہیں پہنچ پاتا، سابق صدر جناب جنرل (ر) پرویز مشرف کی صورتِ حال سب کے سامنے ہے۔ افغانستان بھی بے امنی کے حوالے سے ہم جیسے حالات سے دوچار ہے، میں نے کافی عرصہ پہلے اخبار میں یہ پڑھا تھا: ”حکومتِ افغانستان نے قانون بنایا ہے کہ کسی شخص کی عدم موجودگی میں بھی اس کے خلاف مقدمہ چلا کر آخری مراحل تک پہنچایا جائے گا“، جب کہ ہمارے ہاں اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس قانونی سقم کا سب سے زیادہ سیاست دان اور بااثر لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں، غریب آدمی تو ملک سے فرار نہیں ہو سکتا، وہ زیادہ سے زیادہ ملک کے اندر روپوش ہو سکتا ہے، لیکن خاص طور پر غریب آدمی کے لیے ملک کے اندر روپوشی زیادہ عرصے تک ممکن نہیں ہے۔